POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 17-18 March 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages 8

HAMARI ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 87 واں سال

Date of Publication: 16-03-2026 • Price: 5/- • 22-28 March 2026 • Issue: 12 • Vol:85

۲۲ تا ۲۸/ مارچ ۲۰۲۶ء • شمارہ:۱۲ • جلد:۸۵

صحتِ زباں (۴۲)

رؤف پاریکھ

کمرا یا کمرہ؟

عمارت کے جس حصے کو عربی میں غُرفہ اور حُجرہ کہتے ہیں، جو فارسی میں اُتاق یا اُطاق کہلاتا ہے اور جسے انگریزی میں رُوم (room) کہا جاتا ہے اسے اردو میں عام طور پر کمرہ یا کمرا لکھا جاتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ صحیح املا کمرا ہے، یعنی آخر میں الف۔ بعض اسے کمرہ لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کے آخر میں الف نہیں بلکہ ہائے مختفی لکھنی چاہیے۔

کمرا یا کمرہ؟ کیا درست ہے؟ اس الجھن کو سلجھانے کے لیے کچھ کتابیں جھانکنی پڑیں۔ اس سلسلے میں جو کچھ نظر سے گزرا اس کی جھلکیاں پیش ہیں:

چوں کہ یہ کسی یورپی زبان (غالباً لاطینی) سے نکلا ہوا لفظ ہے لہٰذا پہلے یورپی ماہرین کی مرتبہ لغات دیکھتے ہیں۔ اسٹین گاس نے اپنی فارسی بہ انگریزی لغت میں کمرہ (آخر میں 'ہ') کے معنی dung یعنی لید یا گوبر لکھے ہیں[۱]۔ جان رچرڈسن کی فارسی وعربی بہ انگریزی لغت میں کمرہ کے یہ معنی دیے گئے ہیں: dung of animals (جانوروں کی لید)[۲]۔ کمرا (آخر میں الف) کا اندراج ان دونوں لغات میں نہیں ہے۔ جان شیکسپیئر کی اردو بہ انگریزی لغت نے کمرا (آخر میں الف) دیا ہے اور معنی دیے ہیں a chamber, a room, an apartment۔ 'ہ' کے ساتھ یعنی کمرہ کا اندراج شیکسپیئر نے نہیں کیا[۳]۔ ڈنکن فاربس کی اردو بہ انگریزی لغت نے 'کمرا' درج کیا ہے اور معنی کم وبیش وہی ہیں جو شیکسپیئر نے دیے ہیں۔ 'کمرہ' کا اندراج فاربس کی لغت میں نہیں ہے[۴]۔ البتہ پلیٹس نے 'کمرہ' کو 'کمرا' سے رجوع کرایا ہے اور 'کمرا' کے تلفظ میں لکھا ہے کہ 'م' (میم) پر زبر ہے (یعنی کَمرا) اور 'کمرْا' (یعنی میم ساکن) بقول اس کے گنوارو تلفظ ہے[۵]۔ لیکن اب اردو میں عام تلفظ میم ساکن کے ساتھ ہی رائج ہے۔ پلیٹس اس کی اصل پرتگالی بتاتا ہے اور غالباً اس کی مراد یہ ہے کہ اردو میں پرتگالی سے آیا ہے لیکن اس نے کمرا کو ہندی لفظ قرار دیا ہے۔ پلیٹس کی اس بات کو اس لیے نظر انداز کیا جاسکتا ہے کہ اس کے ہاں لفظوں کی اصل لکھتے ہوئے سنسکرت اور ہندی کی طرف رجحان بہت زیادہ ہے حتیٰ کہ اس نے بعض عربی اور فارسی الفاظ کی اصل بھی سنسکرت بتائی ہے۔ پلیٹس کے پیش رو فیلن نے 'کمرہ' لکھا ہے اور اس کی اصل پرتگالی بتائی ہے اور تلفظ میں میم ('م') کو ساکن ہی لکھا ہے۔ لیکن کمرا (آخر میں الف) کا اندراج اس کے ہاں نہیں ہے۔ معنی اس کے ہاں بھی لگ بھگ وہی ہیں یعنی room وغیرہ[۶]۔

اپنے ہاں کے ماہرین کو دیکھیں تو محمد حسین آزاد نے 'کمرا' لکھا ہے اور کہا ہے کہ یہ اطالی (اطالوی) ہے[۷]۔ فرہنگِ آصفیہ نے 'کمرا' (آخر میں الف) کا اندراج کیا ہے اور اسے لاطینی قرار دے کر کہا ہے کہ جو لوگ اسے پرتگالی کہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ 'کمرا' فارسی میں طاقِ بلند وغیرہ کے معنی میں ہے اور اور اس کی سند میں فارسی اشعار بھی دیے ہیں جن میں اس لفظ کا املا 'کمرا' (آخر میں الف) کیا گیا ہے[۸]۔ لیکن نوراللغات نے اس کا املا 'کمرہ' لکھا ہے یعنی آخر میں 'ہ'۔ 'نور' کے مطابق کمرہ کی اصل لاطینی ہے[۹]۔ جابر علی سیّد کے مطابق اس لفظ کا اصل مادہ ہند جرمانی (ہندالمانی) یعنی انڈو جرمینک (Indo-Germanic) ہے اور یہ انگریزی اور فرانسیسی میں camera ہے یعنی بند کمرہ (انھوں نے آخر میں 'ہ' لکھی ہے)، بقول ان کے آلۂ عکاسی 'کیمرہ' بھی یہی لفظ ہے بمعنی بند ڈبہ[۱۰]۔ (ڈبہ کے آخر میں بھی انھوں نے 'ہ' لکھی ہے، بعض اہلِ علم کے خیال میں الف چاہیے، یعنی ڈبا)۔ ڈاکٹر ف عبدالرحیم نے لکھا ہے کہ 'کمرا' (یہاں انھوں نے آخر میں الف لکھا ہے) پرتگالی لفظ camara سے ماخوذ ہے لیکن اس کی اصل یونانی ہے اور لاطینی میں camera ہے اور لاطینی ہی سے اطالوی، فرانسیسی، ہسپانوی اور انگریزی میں ہجوں کی معمولی تبدیلی کے ساتھ آیا ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ آلۂ تصویر کا نام 'کیمرہ' camera ہے وہ بھی اسی لاطینی لفظ سے ہے اور اس کے معنی انھوں نے دیے ہیں: اندھیرا کمرا[۱۱]۔

اردو لغت بورڈ نے کمرا کا بھی اندراج کیا ہے اور کمرہ کا بھی، اور درست کیا ہے کیوں کہ تاریخی اصولوں پر مرتب کی گئی لغت میں املا کی تمام صورتیں اور لفظ کی تمام شکلیں درج کرنی ہوتی ہیں تاکہ زبان کی تشکیل اور املا کے عہد بہ عہد ارتقا کا اندازہ ہوسکے۔ البتہ بورڈ کی لغت میں 'کمرا' کی اسناد کم ہیں اور 'کمرہ' کی اسناد زیادہ ہیں[۱۲] جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں یہ لفظ 'کمرہ' کی صورت میں یعنی 'ہ' کے ساتھ زیادہ مستعمل رہا ہے۔ بورڈ نے 'کمرہ' کا اشتقاق لکھتے ہوئے اسے 'کمرا' سے رجوع کرایا ہے اور کمرا کا اشتقاق 'مقامی' لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ درست نہیں ہے کیوں کہ اس کی اصل لاطینی ہے، جیسا کہ اوپر کی گفتگو میں ہم نے دیکھا اور اوکسفرڈ کی لغت[۱۳] سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ لیکن بورڈ نے کمرہ کے تحتی یا ذیلی مرکبات کے طور پر کمرۂ استراحت اور کمرۂ جراحت (آپریشن تھیٹر) کا اندراج کیا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر کمرہ کی اصل یا اس کی ماخذ زبان کوئی مقامی زبان یا بولی ہے (یعنی سنسکرت، پراکرت، ہندی، اردو یا کوئی اور مقامی زبان)، جیسا کہ بورڈ کا خیال ہے، تو اس کے ساتھ ہمزۂ اضافت لگا کر مرکب کیسے بن سکتا ہے؟ کیوں کہ اردو میں اردو یا ہندی کے کسی لفظ کے ساتھ کسرہ یا ہمزہ لگا کر مرکبِ اضافی یا مرکبِ توصیفی بنانا عام طور پر ناقابلِ قبول سمجھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے مطابق جو الفاظ اردو میں یورپی زبانوں سے آئے ہیں ان کے آخر میں الف لکھا جائے گا اور انھوں نے جو مثالیں دی ہیں ان میں یہ الفاظ بھی شامل ہیں: کمرا، ڈراما، مارکا (یعنی تجارتی نشان یا trade mark جسے بعض لوگ 'مارکہ' لکھتے ہیں) اور فرما (جو غالباً فارم form کی مؤنّث صورت ہے)[۱۴]۔ صدیقی صاحب کی مراد یہ ہے کہ چوں کہ یہ الفاظ کسی یورپی زبان سے اردو میں آئے ہیں اس لیے ان کے آخر میں الف چاہیے اور ان کے آخر میں 'ہ' لکھنا (یعنی کمرہ، ڈرامہ، مارکہ اور فرمہ) غلط ہے۔

لیکن حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے لکھا ہے کہ حافظ محمود شیرانی کی تحقیق ہے کہ 'کمرہ' فارسی ہے[۱۵]۔ البتہ انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ شیرانی صاحب نے یہ کہاں لکھا ہے۔ شیرانی صاحب جیسے معتبر حوالے اور فرہنگِ آصفیہ میں درج فارسی اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ 'کمرا' یا 'کمرہ' بہرحال فارسی میں وجود رکھتا تھا (اگرچہ فارسی میں مفہوم مختلف ہے)۔ لیکن آصفیہ نے اس کا املا کمرا (آخر میں الف) لکھا ہے اور غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے کمرہ (آخر میں 'ہ')۔ حضرت ڈاکٹر صاحب املا کے معاملے میں بہت محتاط تھے اور یہ بات بھی انھوں نے املائی مباحث کے ذیل میں لکھی ہے لہٰذا اس املا پر غور ضروری ہے، اِلّا یہ

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کرسکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

کہ اس لفظ پر کاتب نے اپنا دستِ ستم دراز کیا ہو۔

اگر ہم اس کا املا 'کمرۂ' (یعنی آخر میں 'ۂ') مان کر کمرۂ جماعت اور کمرۂ امتحان وغیرہ لکھیں یعنی آخر میں 'ہ' اور اس پر ہمزۂ اضافت، اور کوئی کہے کہ نہیں 'کمرا' لکھو تو سوچنا پڑتا ہے کہ پھر ان مرکبات میں کیا ہوگا؟ یعنی کیا 'کمرائے امتحان' اور 'کمرائے جماعت' لکھا جائے گا؟ (بعض لوگ ایسے موقعے پر ہمزہ بھی لکھنے پر اصرار کرتے ہیں یعنی کمرائے جماعت اور بابائے اردو جیسے مرکبات میں، لیکن اصولاً یہاں ہمزہ غیر ضروری ہے)۔

یہ مسئلہ ہماری نظر میں اب بھی تصفیہ طلب ہے۔ بقولِ غالبؔ:

ع کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

لِقا یا لَقا؟

فرہنگِ آصفیہ نے لِقا (لام مکسور) کے دو معنی دیے ہیں، ایک تو دیدار، نظارہ، ملاقات وغیرہ اور دوسرے چہرہ، صورت، شکل۔ پھر مثالاً لکھا ہے: ماہ لقا، حور لقا، خورشید لقا۔ جب کہ لَقا (لام مفتوح) کا مفہوم آصفیہ نے 'ایک قسم کا کبوتر' لکھ کر وضاحت کی ہے کہ یہ کیسا ہوتا ہے، مثلاً گردن اونچی رکھتا ہے، دُم کاغذی پنکھے یا تاڑ کے پتے کی مانند ہوتی ہے۔ آصفیہ کی اس وضاحت سے خیال آتا ہے کہ وہ جو اردو میں کہتے ہیں کہ ''لقا کبوتر کی طرح'' یا ''لقا کبوتر کی طرح گردن اکڑائے ہوئے'' تو اس سے مراد کیا ہوتی ہے۔

لیکن نور اللغات کے مطابق عربی میں لِقاء (لام کے نیچے زیر اور ہمزہ) دیدار کرنا کے مفہوم میں ہے لیکن فارسی والوں نے بغیر ہمزہ کے منھ اور چہرے کے معنی میں استعمال کیا ہے (وہیں سے اردو میں آیا) اور بقول مؤلفِ نور کے یہ لفظ ہر معنی میں بکسرِ اول (لِقا) صحیح ہے اور بفتحۂ اول (لَقا) غلط ہے۔ یہاں ''ہر معنی'' سے مراد غالباً دونوں معنی (یعنی دیدار اور چہرہ) ہیں نیز یہ کہ نور کے مطابق لُقا (لام مضموم) ایک شخص کا نام ہے جس کی داڑھی میں موتی پروئے گئے تھے۔

وارث سرہندی نے نور اللغات پر تبصرہ کرتے ہوئے 'لُقا' پر اعتراض کیا ہے کہ یہ تشریح (ایک شخص کا نام ہے جس کی داڑھی... الخ) ناقص ہے اور یہ کہ:

> ''قدیم زمانے کے بادشاہوں کی ڈاڑھی کے بالوں میں موتی پرونے کی روایات عام ہیں۔ اس لیے اسے لقا سے منسوب کرنا کیا معنی اور نہ اس سے کسی مخصوص شخص کا تصور ذہن میں آتا ہے''[۱۶]۔

لیکن یہ عاجز طالب علم عرض کرتا ہے کہ نور نے لُقا کے معنی (ایک شخص جس کی ڈاڑھی... الخ) کی سند میں غالب کا یہ شعر بھی دیا ہے:

دُرِّ معنی سے مرا صفحہ لُقا کی ڈاڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ عمرو کی زنبیل

حسرت موہانی نے لکھا ہے کہ مشہور ہے کہ لقا کی ڈاڑھی کے ہر ہر بال میں موتی پروئے گئے تھے[۱۷]۔ شاداں بلگرامی کے مطابق لقا داستانِ امیر حمزہ میں ساحروں اور کافروں کے پونے دو سو خداؤں میں سے ایک خدا جو مقابلِ حمزہ ہوتا تھا اور اس کی ڈاڑھی کے بال میں موتی پروئے ہوئے تھے[۱۸]۔ البتہ شاداں بلگرامی نے لکھا ہے کہ غالب نے یہاں عَمرو (یاد رہے کہ 'عمرو' میں واو کا تلفظ نہیں کیا جاتا) کا املا 'امر' (یعنی الف سے) کیا ہے، شاید اسے 'عُمَر' (عین مضموم، میم مفتوح، جو نام ہوتا ہے) سے التباس سے بچانے کے لیے (لیکن یہ ایک الگ بحث ہے)۔ مختصراً یہ کہ لُقا بہر حال ایک شخص، خواہ حقیقی خواہ فرضی، گزرا ضرور ہے اور وارث سرہندی کو مغالطہ ہوا ہے۔

اردو لغت بورڈ نے بھی لُقا درج کیا ہے اور اس کے دو تلفظ بتائے ہیں، ایک قاف پر تشدید کے ساتھ اور ایک بغیر تشدید کے۔ لیکن بورڈ نے لُقا / لُقّا کے معنی دیے ہیں: جس کو آبرو یا عزت کا پاس نہ ہو، لُچّا، بدمعاش، لفنگا[۱۹]۔ نور اللغات نے بھی لُقا کے معنی ''لُچّا، شُہدا'' دیے ہیں (یہ بھی یاد رہے کہ یہاں شُہدا میں 'ہ' ساکن ہے لیکن شہید کی جمع شُہَدا میں 'ہ' پر زبر ہے) لیکن اثر لکھنوی نے اس پر اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''لکھنؤ میں شہدے بدمعاش کو لقندرا یا لنگارا کہتے ہیں''[۲۰]۔

اردو لغت بورڈ نے لِقا (لام کے نیچے زیر) کے معنی دیدار اور چہرہ دونوں درج کیے ہیں اور لَقا (لام پر زبر) کا ایک تلفظ لَقّا (قاف مشدّد) بھی دیا ہے اور معنی دیے ہیں ایک نوع کا کبوتر[۲۱]۔ راجیشور راو اصغر نے لِقا (لام مکسور) کو مؤنث قرار دیا ہے اور اس کا ایک مفہوم 'ملاقات' کے علاوہ 'چہرہ' بھی لکھا ہے، پھر ناصر نامی کسی شاعر کا یہ شعر بطور سند دیا ہے[۲۲]:

خدا کے فضل سے چونکے نصیب سوتے میں
لقائے یار مجھے خواب میں نصیب ہوئی

یہ شعر نور اللغات میں بھی درج ہے لیکن (نور نے پہلے مصرعے کا آخری لفظ 'میں' کے بجائے 'سے' لکھا ہے اور دوسرے مصرعے میں 'خواب' کے بجائے 'وصل' لکھا ہے) لیکن نور نے یہ شعر دیدار اور ملاقات کی سند کے طور پر دیا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ 'چہرہ' کے مفہوم میں نہیں ہے اور صرف ملاقات یا دیدار کی سند کے طور پر آ سکتا ہے۔ اسٹین گاس نے یہ مسئلہ یوں حل کیا ہے کہ لَقا (لام مفتوح) اور لَقّا (لام مفتوح، قاف مشدد) کے معنی کبوتر دیے ہیں اور لِقا (لام مکسور) کے معنی چہرہ دیے ہیں۔ پھر لِقاء (لام مکسور اور آخر میں ہمزہ) لکھ کر واضح کیا ہے کہ اس کے معنی ملاقات وغیرہ ہیں نیز جو نظر آئے اور اسی سے، بقول اس کے، فارسی کے جدید روزمرہ (modern colloquialism) میں چہرہ وغیرہ کے معنی پیدا ہو گئے ہیں۔

البتہ اردو میں لِقا (لام مکسور) اکیلا نہیں آتا اور مہ لقا یا ماہ لقا جیسی ترکیب میں مستعمل ہے۔ ماہ یا مہ چاند کو کہتے ہیں لہٰذا ماہ لِقا یا مہ لِقا کا مطلب ہے چاند سے چہرے والا یا والی۔ اور مراد ہے بہت حسین۔ ذوق کا شعر ہے:

منھ ہے کیا جو رنگ سے مہتاب کے ہم تاب ہو
غازے سے ہر چند چمکے رنگِ رُوے مہ لقا

ماحصل یہ کہ لِقا اور لَقا دونوں درست ہیں مگر دونوں کے مفہوم میں فرق ہے۔ لِقا (لام مکسور) دیدار یا ملاقات نیز چہرہ کے معنی میں ہے اور لَقا (لام مفتوح) ایک قسم کا کبوتر ہے۔ البتہ لُقا بھی ایک لفظ ہے اور اس ضمن میں وارث سرہندی سے اختلاف کرنا پڑے گا۔ لُقا (تشدید کے بغیر) ایک شخص، خواہ داستانوں میں سہی، گزرا ہے جس کی ڈاڑھی کے بال بالا میں موتی پروئے گئے تھے اور لُقا میں اگر قاف پر تشدید ہے تو بدمعاش اور لفنگے کے مفہوم میں ہے۔

حواشی:

۱۔ A Comprehensive Persian-English Dictionary (مرتبہ ایف اسٹین گاس F. Steingass)، (لاہور: سنگِ میل، ۲۰۰۰ء) (عکسی طباعت، اشاعتِ اول ۱۸۹۲ء)۔

۲۔ Dictionary Persian, Arabic and English (مرتبہ جان رچرڈسن و فرانسس جانسن John Richardson & Francis Johnson)، (لاہور: سنگِ میل، ۱۹۹۸ء) (عکسی طباعت، ایڈیشن ۱۸۲۹ء)۔

۳۔ Dictionary Urdu-English and English-Urdu (مرتبہ جان شیکسپیئر John Shakespear)، (لاہور: سنگِ میل، ۱۹۹۶ء) (عکسی طباعت)

۴۔ Dictionary of the Hindustani Language (مرتبہ ڈنکن فاربس Duncan Forbes)، (لندن: کراسبی لاک وڈ اینڈ سن، ۱۸۶۶ء) (دوسرا ایڈیشن)

۵۔ A Dictionary of Urdu, Classical Hindi and Einglish، (مرتبہ جان ٹی پلیٹس John T. Platts)، لندن: کراسبی لاک وڈ اینڈ سن، ۱۹۱۱ء (اشاعتِ اول ۱۸۸۴ء)۔

۶۔ A New Hindustani-English Dictionary، مرتبہ (ایس ڈبلیو فیلن S.W.Fallon)، (دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۲۰۰۴ء)، (اشاعتِ اول: ۱۸۷۹ء)۔

۷۔ آبِ حیات (مرتبہ ابرار عبدالسلام)، (ملتان: بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۶ء)، ص ۲۴۔

۸۔ فرہنگِ آصفیہ، مبنی بر چہار جلد (مرتبہ سید احمد دہلوی)، (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۷۷ء)۔

۹۔ نور اللغات، مبنی بر چہار جلد (مرتبہ نور الحسن نیر کاکوروی)، (اسلام آباد: نیشنل بک فاونڈیشن، ۱۹۸۹ء) (طبع سوم)

۱۰۔ لسانی و عروضی مقالات (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء)، ص ۲۰۔

۱۱۔ پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ الفاظ سے (لاہور: کتاب سرائے، ۲۰۱۶ء)، ص ۱۲۰ (بارِ دوم)۔

۱۲۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد ۵ (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۹۳ء)۔

۱۳۔ Concise Oxford English Dictionary، اوکسفرڈ، ۲۰۱۱ء (بارھواں ایڈیشن)۔

۱۴۔ مقالاتِ صدیقی (لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۳ء)، ص ۵۔

۱۵۔ جامع القواعد، حصۂ نحو (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۷۳ء)، ص ۱۸۹۔

۱۶۔ کتبِ لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ، جلد ۶، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء)، ص ۱۸۱۔

۱۷۔ شرحِ دیوانِ غالب (لاہور: خزینۂ علم و ادب، ۲۰۰۲ء)، ص ۲۷۰۔

۱۸۔ شرحِ دیوانِ غالب (اردو)، (کراچی: ناشر احمد رضا بلگرامی، ۱۹۹۷ء)، ص ۶۰۵۔

۱۹۔ فرہنگِ اثر (بسلسلۂ کتبِ لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ، جلد ۴)، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء)، ص ۵۱۸۔

۲۰۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد ۱۶، (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۹۴ء)۔

۲۱۔ ایضاً۔

۲۲۔ قرانُ السَّعدَین مع مجمع البحرَین (مرتبہ انجم حمید) (اسلام آباد: ادارۂ فروغِ قومی زبان، ۲۰۲۲ء)، ص ۴۸۵۔

ریٹائرڈ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ،
کراچی-75270 (پاکستان)
E-mail: drraufparekh@yahoo.com

اردو ہندی ڈکشنری
انجمن ترقی اردو (ہند)
قیمت: 300 روپے

اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری
مولوی عبدالحق
قیمت: 500 روپے

قلم کی تدفین اور اے آئی کا راج

اردو شعر و ادب کی ڈیجیٹل موت؟

ڈاکٹر انیس صدیقی

عہدِ موجود میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی برق رفتار ترقی نے جہاں انسانی زندگی کو سہولتوں کے نئے جہان عطا کیے ہیں، وہیں اس کے بے لگام اور منفی استعمال نے کئی سنگین اخلاقی و سماجی بحرانوں کو بھی جنم دیا ہے۔ ایجادات ہمیشہ انسانی ارتقا میں معاون اور سہولت بخش ثابت ہوئی ہیں، تاہم وہی ایجادات جب انسانی شعور اور فطری تخلیقی صلاحیتوں کی جگہ لینے لگیں تو ایک المیہ جنم لیتا ہے۔

دورِ حاضر میں مصنوعی ذہانت (AI) کی آمد نے عالمی سطح پر ایک ایسا ہی فکری بحران پیدا کر دیا ہے، جس نے تخلیقِ ادب کی اساسی روح کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ادبی معاشرے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اے آئی کی کرم فرمائی کے نتیجے میں 'تخلیق کار' اور 'صارف' کے درمیان کی سرحدیں تیزی سے دھندلا رہی ہیں، جس سے ادب کے حقیقی مستقبل پر کئی سوالیہ نشان ثبت ہوگئے ہیں۔

> المیہ یہ بھی ہے کہ وہ لوگ جو اردو زبان و ادب کی بنیادی شد بد سے بھی واقف نہیں، اب اے آئی کی مدد سے وقیع مضامین لکھ رہے ہیں اور غزلیں و افسانے 'تخلیق' کر رہے ہیں۔ نثری نظموں اور افسانچوں کے ڈھیر لگائے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ گہرے تبصراتی اور تجزیاتی مضامین بھی سیکنڈوں میں تیار کیے جا رہے ہیں۔ اس مشینی سہولت نے ادب میں مقدار کا سیلاب تو برپا کر دیا ہے، مگر معیار کا جنازہ نکال دیا ہے اور ادب اب ریاضت کے بجائے 'شارٹ کٹ' کا نام بنتا جا رہا ہے۔

ماضی بعید و قریب میں قلم اٹھانے کے لیے 'خونِ جگر' کی ضرورت ہوتی تھی۔ برسوں کا مطالعہ، مشاہدہ، زبان کی نزاکتوں کا ادراک اور پیہم مشقِ سخن ہی کسی کو ادیب یا شاعر کے منصب پر فائز کرتی تھی۔ ایک تخلیق کار اپنی تحریر کے پیچھے اپنی پوری زندگی کا نچوڑ، اپنے دکھ، اپنی خوشیاں اور اپنی تہذیب کی پوری تاریخ سمو دیتا تھا، مگر اب اے آئی نے ہر اس شخص کو 'ادیب' اور 'قلم کار' بننے کی جھوٹی سہولت فراہم کر دی ہے جو محض چند الفاظ کی ہدایت لکھنا جانتا ہو۔ المیہ یہ بھی ہے کہ وہ لوگ جو اردو زبان و ادب کی بنیادی شد بد سے بھی واقف نہیں، اب اے آئی کی مدد سے وقیع مضامین لکھ رہے ہیں اور غزلیں و افسانے 'تخلیق' کر رہے ہیں۔ نثری نظموں اور افسانچوں کے ڈھیر لگائے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ گہرے تبصراتی اور تجزیاتی مضامین بھی سیکنڈوں میں تیار کیے جا رہے ہیں۔ اس مشینی سہولت نے ادب میں مقدار کا سیلاب تو برپا کر دیا ہے، مگر معیار کا جنازہ نکال دیا ہے اور ادب اب ریاضت کے بجائے 'شارٹ کٹ' کا نام بنتا جا رہا ہے۔

مصنوعی ذہانت کے مضر اثرات کسی ایک صنف تک محدود نہیں بلکہ اس نے پورے ادبی منظر نامے کو اپنی زد میں لے لیا ہے۔ غزل، جو داخلیت اور وارداتِ قلبی کا نام ہے، اب محض بحور و اوزان کی ایک میکانکی مشق بن کر رہ گئی ہے۔ مشین لغت کی مدد سے قافیہ اور ردیف تو جوڑ سکتی ہے، لیکن وہ 'کیفیت' کہاں سے لائے گی جو شاعر کے کلام کا خاصہ ہوتی ہے؟ جب ایک سافٹ ویئر مصرعے ترتیب دیتا ہے، تو اس میں ریاضیاتی درستی تو ہوتی ہے مگر وہ دردمندی اور سوز مفقود ہوتا ہے، جو انسانی روح کی پکار ہے۔ اسی طرح افسانہ نگاری میں کہانی کار کا مشاہدہ اور معاشرتی شعور جب مشینی ڈیٹا کے تابع ہوتا ہے، تو افسانہ اپنی فطری مہک کھو دیتا ہے۔ نثری نظموں کے نام پر الفاظ کا جو انبار لگایا جا رہا ہے، اس میں ابلاغ تو ہے، مگر احساس کی تپش نہیں۔ سب سے زیادہ نقصان تنقید کا ہوا ہے، کیونکہ جب مشین ہی تجزیاتی مضامین تیار کرنے لگے، تو تخلیق کی پرکھ کا وہ معروضی اور بصیرت افروز معیار ختم ہو جاتا ہے، جو ایک زندہ نقاد کا منصب ہے۔

مسئلہ محض شعر و ادب تک محدود نہیں، بلکہ اے آئی کے بطن سے ایسے 'خود ساختہ قلمکار' جنم لے رہے ہیں جن کی تحریروں میں بظاہر تبحرِ علمی کا تنوع اور زبان دانی کی مہارتیں لشکارے مارتی نظر آتی ہیں۔ یہ نام نہاد قلم کار کسی بھی علمی اختصاص کے بغیر 'بحر العلوم' بنے بیٹھے ہیں اور کائنات کے ہر موضوع پر پلک جھپکتے میں خامہ فرسائی پر قادر ہیں۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ان بندگانِ خدا کو اس بات کا احساس تک نہیں کہ ان کے اطراف کا علمی و ادبی حلقہ ان کی اصل صلاحیتوں اور ان مشینی بیساکھیوں سے بخوبی آگاہ ہے۔ یہ لوگ وقتی شہرت اور سوشل میڈیا پر 'لائیکس' کی دوڑ میں یہ بھول گئے ہیں کہ ادبی وقار ادھار لی ہوئی ذہانت سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اردو شعر و ادب کی بقا اس بات میں ہے کہ ہم الفاظ کے جادو کو برقرار رکھیں اور اسے مشینی پروسیسرز کی بھینٹ نہ چڑھنے دیں۔ یہاں یہ نکتہ نہایت اہم ہے کہ زبان محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتی، بلکہ یہ ایک پوری تہذیب، تاریخ اور نفسیات کی حامل ہوتی ہے۔ اردو زبان کا ہر لفظ اپنے اندر صدیوں کی خوشبو، صوفیانہ روایات اور گنگا جمنی تہذیب کے رنگ سمیٹے ہوئے ہے۔ جب ایک ادیب کوئی لفظ استعمال کرتا ہے، تو اس کے پیچھے اس کا اپنا خاندانی پس منظر، اس کی مٹی کا لمس اور اس کے معاشرے کے دکھ سکھ شامل ہوتے ہیں۔ مصنوعی ذہانت کے پاس 'الفاظ کا ڈیٹا' تو موجود ہے لیکن الفاظ کی تہذیب نہیں۔ مشین یہ تو جانتی ہے کہ لفظ 'ہجر' کے معنی جدائی کے ہیں، لیکن وہ اس تڑپ سے نا آشنا ہے، جو ایک عاشق کی روح میں موجزن ہوتی ہے۔ مشینی تحریروں میں الفاظ بے جان جسم کی طرح ہوتے ہیں، جن میں تخلیقی روح کی رمق تک نہیں ہوتی۔ یہ ٹیکنالوجی جملوں کی ساخت تو درست کر سکتی ہے مگر اس کے پیچھے چھپے ہوئے استعاروں اور تلمیحات کی اس معنوی گہرائی کو کبھی نہیں پا سکتی جو انسانی وجدان کا خاصہ ہے۔

اس صورتِ حال کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس مشینی یلغار میں وہ حقیقی شعرا، ادبا اور قلمکار بھی شک کے دائرے میں آ گئے ہیں، جنھوں نے اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے۔ جب ہر دوسرا شخص 'ڈیجیٹل شاہکار' سوشل میڈیا پر سجا رہا ہو، تو عام قاری کے لیے یہ تمیز کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ کون سا لفظ کربِ ذات سے نکلا ہے اور کون سا پروسیسر کی پیداوار ہے۔ یہ بے یقینی جینوئن قلم کاروں کے لیے ایک ذہنی کرب کا باعث ہے، جہاں ان کی برسوں کی ریاضت کو مشینی کارروائی سمجھ کر نظر انداز کیے جانے کا اندیشہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔

اردو ادب کو اس ڈیجیٹل یلغار سے محفوظ رکھنے کے لیے اب یہ ناگزیر ہو چکا ہے کہ ایک ایسا دفاعی میکانزم تیار کیا جائے، جو انسانی وجدان اور مشینی ترتیبِ الفاظ کے درمیان واضح لکیر کھینچ سکے۔

آخر کار، اردو کا مستقبل اسی صورت میں محفوظ ہے جب ہم ٹیکنالوجی کو تخلیق کا متبادل بنانے کے بجائے اسے سچ اور جھوٹ کی تمیز کے لیے ایک ڈھال کے طور پر استعمال کریں۔ اخبارات اور ادبی رسائل کے مدیران پر اب یہ بھاری ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ معیار پر سمجھوتہ نہ کریں اور ہر تحریر کو انسانی تخلیق کے حلف نامے سے مشروط کریں۔ فن وہی زندہ رہتا ہے جو مشین کے پروسیسر سے نہیں بلکہ انسان کے دل سے برآمد ہوا ہو، کیونکہ دل سے نکلی ہوئی بات ہی دل پر اثر کرتی ہے۔

Plot No. 19, Gulmohar Hills,
Ring Road, Gulburagi-585105
Mob. No.: 9342353312
E-mail: draneessiddiqui@yahoo.com

اردو دُنیا

ڈاکٹر سیّد مبین زہرا رام پور رضا لائبریری کی اشاعتی مشاورتی کمیٹی کی رکن نامزد

نئی دہلی (14 مارچ)۔ دہلی یونیورسٹی کے آتما رام سناتن دھرم کالج کے شعبۂ تاریخ کی ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر سیّد مبین زہرا کو اتر پردیش کی اٹھارہویں صدی کی عالمی شہرت یافتہ رامپور رضا لائبریری کی اشاعتی مشاورتی کمیٹی کا رکن نامزد کیا گیا ہے۔ رامپور رضا لائبریری کی صدر، اتر پردیش کی معزز گورنر کی صدارت میں منعقدہ رامپور رضا لائبریری بورڈ کی 53ویں میٹنگ میں یہ عہدہ انھیں تفویض کیا گیا۔ رامپور رضا لائبریری اینڈ میوزیم کے ڈائرکٹر ڈاکٹر پشکر مشرا نے ڈاکٹر سیّد مبین زہرا کو ایک خط کے ذریعے مبارکباد پیش کرتے ہوئے یہ اطلاع دی ہے۔ ڈاکٹر پشکر مشرا نے خط میں کہا کہ ڈاکٹر سیّد مبین زہرا کی شاندار علمی حیثیت، وسیع تجربہ اور گہری تعلیمی بصیرت سے رامپور رضا لائبریری بلاشبہ بے حد مستفید ہوگی۔ ان کی دور اندیشی اور مہارت لائبریری کی اشاعتی سرگرمیوں میں اہم رہنمائی فراہم کرے گی۔ ان کی موجودگی خاص طور پر تحقیقی متن کی تدوین و اشاعت، نایاب مخطوطات کی اشاعت، دوبارہ طباعت، ترجمہ، انتخاب اور علمی مواد کے معیار کو یقینی بنانے میں اہم رہنمائی ادا کرے گی۔ ڈاکٹر پشکر مشرا نے اپنے خط میں لکھا کہ انھیں امید ہے کہ ڈاکٹر سیّد مبین زہرا اشاعتی مشاورتی کمیٹی کی رکن کے طور پر اپنے قیمتی تجربات اور تجاویز سے رامپور رضا لائبریری کی اشاعتی منصوبہ بندی کو نئی سمت دیتے ہوئے اس کی تعلیمی شہرت اور علمی دولت کے وسیع تر پھیلاو میں اہم کردار ادا کریں گی۔ ڈاکٹر پشکر مشرا نے انھیں کامیاب، متاثر کن اور قابلِ فخر دورِ کار کے لیے بھی نیک خواہشات پیش کی ہیں۔ واضح رہے کہ رامپور رضا لائبریری اور میوزیم ہندستانی اسلامی ثقافتی ورثے کا ذخیرہ ہے۔ اس میں مخطوطات، تاریخی دستاویز، اسلامی خطاطی کے نمونے، مختصر پینٹنگز، فلکیاتی آلات اور عربی اور فارسی زبانوں میں نادر و نایاب تصاویر کا بہت اہم اور قیمتی سرمایہ موجود ہے۔

(سیاسی تقدیر۔ دہلی)

شعبۂ اردو، اے ایم یو میں ریسرچ ایسوسی ایشن کے تحت پروگرام کا انعقاد

علی گڑھ (12 مارچ)۔ ''مقالہ نگاری مشق و مزاولت کے ساتھ اساتذہ کی رہنمائی چاہتی ہے، اگر اساتذہ کے مشوروں پر عمل کیا جائے تو یقینی طور پر اس کے مثبت نتائج برآمد ہوتے ہیں''۔ یہ باتیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے چیئرمین پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی نے رشید احمد صدیقی آڈیٹوریم میں ریسرچ ایسوسی ایشن کے جلسے سے بطورِ صدر خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ ریسرچ ایسوسی ایشن کے جلسے اسی لیے ہوتے ہیں تاکہ طلبہ و طالبات میں لکھنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ انھوں نے کہا کہ آپ اپنی تحقیق کے لیے متعینہ موضوع پر تو کام کر ہی رہے ہیں، اس کے ساتھ اس موضوع کے ان متعلقات پر علمی مضامین لکھیں جو اس موضوع کو روشن کرنے والے ہوں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ طلبہ کو اپنے اساتذہ سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے، ریسرچ ایسوسی ایشن کے جلسے بھی اسی مقصد سے منعقد کیے جاتے ہیں۔ ان پروگراموں میں آپ کے مضامین پر جو رائے دی جاتی ہے وہ دراصل آپ کو مثبت سمت دینے کی کوشش ہے۔ پروگرام میں ریسرچ اسکالر توحید احمد نے آمنہ ابوالحسن کی افسانہ نگاری پر جب کہ ریسرچ اسکالر سیما نے اردو اور دیگر زبانیں: تاریخی اور ثقافتی تناظر پر اپنے مقالے پیش کیے۔ پروفیسر محمد علی جوہر نے طلبہ و طالبات کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ مقالہ لکھنا اپنے آپ میں ایک اہم علمی کاوش ہے لیکن اسے اچھے انداز میں پیش کرنا ایک آرٹ ہے، آپ کو یہاں مقالہ نگاری کے ساتھ ہی پیشکش کا آرٹ بھی سکھایا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تمام مقالے محنت سے لکھے گئے لیکن چوں کہ آپ لوگ ابھی نوآموز ہیں اس لیے غلطیوں کے امکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن آپ کو اپنی اصلاح کرتے رہنا چاہیے۔ پروگرام کی نظامت ایسوسی ایشن کے سکریٹری عبدالوحید نے کی۔ پروگرام میں پروفیسر سیّد سراج الدین اجملی، پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی، ڈاکٹر سلطان احمد، ڈاکٹر خالد سیف اللہ، ڈاکٹر عمر رضا، ڈاکٹر شارق، ڈاکٹر مامون رشید، ڈاکٹر معید رشیدی، ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی، ڈاکٹر خلیق الزماں، ڈاکٹر حامد رضا، ڈاکٹر کیف فرشوری، ڈاکٹر خالد سرفراز، ڈاکٹر احسن ایوبی اور ڈاکٹر شفا مریم سمیت دیگر اساتذہ اور طلبہ و طالبات موجود تھے۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

محی الدان پاشاہ باوقار میڈیا اکیڈی ایوارڈ سے سرفراز

گلبرگہ (13 مارچ)۔ سینئر صحافی الحاج محی الدین پاشاہ (مدیر اعلا روزنامہ 'انقلابِ دکن' گلبرگہ) کو بینکوئٹ ہال ودھان سودھا بنگلور میں ایک پُروقار تقریب میں کرناٹک میڈیا اکیڈمی کے سال 2025 کے باوقار سالانہ ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ یہ ایوارڈ وزیر اعلا سدرمیا کے ہاتھوں تفویض کیا گیا۔ اس تقریب میں کے. وی. پربھاکر، پی. سی. موہن، رضوان ارشد، عائشہ خانم (صدر کرناٹک میڈیا اکیڈمی بنگلور)، بی پی کاویری (سکریٹری برائے انفارمیشن حکومت کرناٹک)، ہمنمت نمبالکر (کمشنر محکمۂ انفارمیشن) کے علاوہ ریاستی صدر کرناٹک جرنلسٹ ایسوسی ایشن نے شرکت کی۔ تقریب میں الحاج محی الدین پاشاہ کے علاوہ دیگر صحافیوں محمد اسد، محترمہ گلنار مرزا، ڈی کمار سوامی، کے. ایس. بن شنکر، ارادھیا، منجوناتھ وائی پاٹل، بھیما نائیک، ردر پا آسنگی، ستیش آچاریہ، نیلکنٹھ اے آر، کے. لکشمن، منجوناتھ ٹی کو بھی ایوارڈ تفویض کیا گیا۔

الحاج محی الدین پاشاہ کی طویل صحافتی، ملّی، سماجی خدمات کے پیشِ نظر کرناٹک میڈیا اکیڈمی نے انھیں یہ ایوارڈ تفویض کیا ہے۔ واضح رہے کہ الحاج محی الدین پاشاہ کو اس سے قبل کئی تنظیموں کی جانب سے ایوارڈ سے سرفراز کیا جاچکا ہے، جن میں سینئر جرنلسٹ ایوارڈ، مرزا رفیع میموریل ایوارڈ، شری کاگلکر ایوارڈ، انمول رتن ایوارڈ، حضرت مولانا رومی ایوارڈ، سینئر جرنلسٹ ایوارڈ، ایس کے یو پی ایس کلبرگی ڈسٹرکٹ ایوارڈ، محمد یعقوب خاں صحافتی ایوارڈ شامل ہیں۔

(روزنامہ 'انقلابِ دکن'۔ گلبرگہ)

عصری مسائلِ تعلیم پر مبنی کتاب 'تعلیم کے عصری مسائل اور تقاضے' کی رسمِ اجرا

دربھنگہ (13 مارچ)۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (مانو) کے کالج آف ٹیچر ایجوکیشن (سی ٹی ای) دربھنگہ میں 12 مارچ کو منعقدہ ایک پروگرام کے دوران ڈاکٹر آفتاب عالم کی تصنیف 'تعلیم کے عصری مسائل اور تقاضے' نامی کتاب کی رونمائی ہوئی۔ متعلقہ کتاب کی رونمائی مولانا آزاد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر سیّد عین الحسن، رجسٹرار سیّد اشتیاق احمد، ڈین اکیڈمک اور بہار کے انچارج پروفیسر محمد شاہد، اسکول آف ٹیکنالوجی کے ڈین پروفیسر عبدالواحد اور دربھنگہ سٹیلائٹ کیمپس و کالج کے پرنسپل پروفیسر محمد فیض احمد کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر کالج کے متعدد عہدیداران، اساتذہ، طلبہ و غیر تدریسی عملے نے شرکت کی۔ اس مناسبت سے خطاب کرتے ہوئے وائس چانسلر پروفیسر عین الحسن نے ڈاکٹر آفتاب عالم کی علمی کاوش کو سراہا اور معاصر معاشرے میں تعلیم کے ابھرتے ہوئے چیلنجوں سے نمٹنے میں تحقیقی و تصنیفی کاموں کی اہمیت پر زور دیا۔ نئی جاری کردہ کتاب میں تعلیم کے مختلف عصری مسائل اور تقاضوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، جن میں جامع تعلیم، تیسری جنس کی تعلیم، اقدار کی تعلیم، تعلیم کی نجکاری، پبلک پرائیویٹ پارٹنر شپ (پی پی پی)، عالمگیریت، آزادیت اور مجموعی نشوونما میں جسمانی تعلیم کا کردار جیسے موضوعات شامل ہیں۔ قابلِ ذکر ہے کہ وائس چانسلر موصوف کے کالج کے گذشتہ دورے کے دوران بھی ڈاکٹر آفتاب عالم کی تصنیف 'ہندستان میں پس ماندہ طبقات کی تعلیم' کی رسمِ اجرا عمل میں آئی تھی۔ یہ ابتدائی کتاب ہندستان میں پس ماندہ طبقوں کی تعلیمی صورتِ حال اور انھیں درپیش چیلنجوں پر مرکوز تھی۔ پروگرام میں موجود اساتذہ نے مصنف کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ یہ نئی کتاب تعلیم کے بدلتے ہوئے منظرنامے کو سمجھنے میں دلچسپی رکھنے والے محققین، اساتذہ اور طلبہ کے لیے ایک قیمتی علمی سرمایہ ثابت ہوگی۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

ادارہ ادبِ اسلامی میرا روڈ کی جانب سے شاندار مشاعرہ

میرا روڈ، ممبئی (29 جنوری)۔ 26 جنوری 2026 کو شام سات بجے ادارۂ ادبِ اسلامی ہند کی میرا روڈ یونٹ نے ایک شاندار مشاعرے کا انعقاد کیا۔ یہ مشاعرہ اسلامی سنٹر میرا روڈ میں منعقد ہوا، جو ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کا ایک اہم مرکز ہے۔ مشاعرے کی صدارت کُل ہند صدر ادارہ ادبِ اسلامی ہند ڈاکٹر سلیم خاں نے کی۔ نظامت یوسف دیوان نے بہ حسن و خوبی انجام دی۔ یوسف دیوان مشاعرے میں اپنی بہترین پیش کش اور منفرد انداز کے لیے مشہور ہیں۔ مشاعرے میں ڈاکٹر چشتی محمد طارق نے بطورِ مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز حسبِ روایت حمد و نعتِ پاک سے ہوا، جس نے مشاعرے میں روحانی ماحول قائم کیا۔ مشاعرے کے ناظم محمد طاہر شاہ (صدر ادارہ ادبِ اسلامی میرا روڈ) نے تمام شعرا و شرکا کا پُرتپاک استقبال کیا اور تمام شعرا کی خدمت میں تحائف پیش کیے۔ مشاعرے میں کہنہ مشق استاد شعرا کے ساتھ ساتھ نوجوان شعرا کو بھی موقع دیا گیا تاکہ نئی نسل کی آبیاری ہو سکے۔ شعرا میں یوسف رانا، رشید بشر، اسلم ثانی، ملک عظیم، مستحسن عزم، یوسف دیوان، محشر فیض آبادی، سعید خاں، حسنین ساحل جیسے کہنہ مشق شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ تمام شعرا کے کلام کو پسند کیا گیا۔ مشاعرے میں کثیر تعداد میں مقامی اور دیگر علاقوں سے سامعین کے علاوہ ادبی حلقوں کے لوگ شامل تھے۔ یہ تعداد ادبی محفلوں کی مقبولیت اور بڑھتی دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے۔ آخر میں صدر مشاعرہ ڈاکٹر سلیم خاں نے اپنے اختتامی خطاب میں تمام شعرا کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ معیاری کلام اور بامقصد شاعری معاشرے کی ایک اہم ضرورت ہے۔ مشاعرہ تفریحِ طبع سے آگے اصلاحِ فکر و جذبات کا ذریعہ بھی ہے۔ ناظمِ مشاعرہ محمد طاہر شاہ نے تمام مہمانان اور شعرا کا شکریہ ادا کیا۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

اُردو زبان و ادب کا پہلا محقق و مدرس

جان بارتھ وِک گل کرسٹ

تالیف و ترجمہ: صدیق الرحمٰن قدوائی

قیمت: 250 روپے

کالی کٹ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں علم و ادب کی کہکشاں:

ڈاکٹر طیب خرادی کا فکر انگیز خطاب

کالی کٹ (فروری)۔ ریاست کیرلا کی علمی فضاؤں میں اردو زبان وادب کی خوشبو تیزی سے پھیل رہی ہے۔اس کا تازہ مظہر کالی کٹ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں منعقدہ وہ پُر وقار علمی نشست تھی جس میں ممتاز اسکالراور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر طیب خرادی نے طلبہ سے 'اردو زبان وادب کی تاریخ و تدریس' کے موضوع پر ایک نہایت جامع اور موثر خطاب کیا۔

ڈاکٹر طیب خرادی نے طلبہ کواردو ادب کو اپنا 'اوڑھنا بچھونا' بنانے کی تلقین کرتے ہوئے سیکھنے کے آسان اور سائنسی طریقے سمجھائے۔انھوں نے زور دے کر کہا کہ سب سے پہلے زبان و بیان کی پختگی ضروری ہے اور آپ اپنی تحریروتقریر میں مہارت پیدا کریں اور املا وقواعد کی باریکیوں کو سمجھیں، پھر ترتیب وار مطالعہ ہو۔ ادب کا مطالعہ بے ترتیب نہ ہو بلکہ حصۂ نظم ونثر اوران کی اصناف کا باری باری مطالعہ کریں۔ ادب کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کریں۔محض سطحی مطالعہ کافی نہیں بلکہ اصناف کی تاریخ، فن، تخلیقات اور مشاہیرادب کے کام کو گہرائی سے پرکھیں۔

مادری زبان کا چیلنج: انھوں نے کیرلا کے طلبہ کی ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ اردو آپ کی مادری زبان نہیں ہے لیکن درج بالا ترتیب سے پڑھنے پر نہ صرف مہارت حاصل ہوگی بلکہ تحقیق کے نئے دَر واہوں گے اور تقابلی امتحانات میں غیبی نصرت حاصل ہوگی۔ رپورٹ کے مطابق کالی کٹ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کا قیام محض دو سال قبل عمل میں آیا ہے، جو جنوبی ہند کی مایۂ ناز شخصیت اور فخرِ جنوب پروفیسر سیّد سجاد حسین اوران کے لائق فخر شاگرد نکولن کنڈوت ولپل کی شبانہ روز محنتوں کا مرہونِ منت ہے۔ڈاکٹر نکولن جوفی الوقت اس شعبے کے صدر ہیں، ان کی اَنتھک کوششوں سے یہ شعبہ آج ایک تناور درخت بننے کی جانب گامزن ہے۔

شعبے میں ایم اے سالِ اول اور سالِ دوم میں کل 40 طلبہ زیرِ تعلیم ہیں جن میں اردو سیکھنے کا غیر معمولی جذبہ پایا جاتا ہے۔ صدرِ شعبہ کے ہمراہ تین دیگر جیّد اساتذہ اپنی کُل وقت خدمات انجام دے رہے ہیں جن میں ڈاکٹر ابوبکر پیّار گڈاون، ڈاکٹر محمد امان اے. کے، ڈاکٹر محمد رضوان انصاری شامل ہیں۔ان اساتذہ کی سرپرستی میں طلبہ ہر علمی نکتے کو نہایت توجہ سے نوٹ کرتے ہیں۔

کیمپس کا ماحول کسی پُرسکون عالمی علمی دانش گاہ سے کم نہیں۔ ایک عالیشان محل نما عمارت میں واقع شعبۂ اردو میں کشادہ درس گاہیں موجود ہیں۔ علمی ضروریات کے لیے ایک مخصوص اردو لائبریری قائم کی گئی ہے جہاں کُل وقتی لائبریرین، کلرک اور آفس اسسٹنٹ شعبے کی انتظامی اور تعلیمی ترقی کے لیے مستعد ہیں۔اس تقریب کی ایک خاص کڑی ڈاکٹر طیب خرادی کی جانب سے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف 'جنوبی ہند میں اردو طنز ومزاح ماقبل آزادی' کا بطورِ تحفہ پیش کیا جانا تھا۔ یہ علمی سوغات این سی ای آر ٹی (نئی دہلی) کی ممتاز پروفیسر محترمہ چمن آرا کے دستِ مبارک سے شعبے کی لائبریری کی نذر کی گئی۔امید کی جارہی ہے کہ اساتذہ کی لگن اور طلبہ کے شوق کی بدولت یہ شعبہ مستقبل میں جنوبی ہند میں اردو کی ترویج و اشاعت کا سب سے بڑا مرکز بن کر ابھرے گا۔ (مدراس ٹائمز۔چینئی)

اردو اور دیگر زبانوں میں درسی کتاب کی تیاری کے لیے چھے ہزار کروڑ کا بجٹ

حیدرآباد (10 فروری)۔ حکومتِ ہند نے اردو کے بشمول مختلف ہندستانی زبانوں میں اعلا تعلیمی درسی کتب کی تیاری کے لیے اگلے مالی سال میں چھے ہزار کروڑ روپے کا بجٹ مختص کیا ہے۔ اس کے ذریعے 2.5 لاکھ علمی کتابوں کی تیاری کا ہدف ہے۔ اس بات کا انکشاف ڈاکٹر چندن شریواستو (اکیڈمک کوآرڈینیٹر بھارتیہ بھاشا سمیتی، نئی دہلی) نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد میں اردو مصنّفین کے دو روزہ ورکشاپ کے افتتاحی اجلاس میں بحیثیت مہمانِ خصوصی آن لائن خطاب کے دوران کیا۔ پروفیسر سیّد عین الحسن، شیخ الجامعہ نے صدارت کی، پروفیسر وِیبھا شرما (شعبۂ انگریزی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے بھی مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ پروفیسر اشتیاق احمد (رجسٹرار) اور پروفیسر رضاء اللہ خاں (ڈائرکٹر مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم — سی ڈی او ای) مہمانِ خصوصی تھے۔ پروفیسر خالد مبشر الظفر (ڈائرکٹر ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن، ٹرانسلیشن اسٹڈیز، لیکسیکوگرافی اپلی کیشن) نے جو بی بی ایس اردو کے کوآرڈینیٹر بھی ہیں، خیر مقدم کیا۔ پروفیسر ابوشحیم خاں نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔اس موقعے پر ڈی ٹی ٹی ایل پی کے ذریعے شائع کردہ پانچ کتب ہیومن بنگی: وی وائس جیرنٹ آف اللہ آن ارتھ (انسان: زمین پر اللہ کا خلیفہ)، مصنف: پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، ہندستانی علمی نظام، مصنف: پروفیسر محمد مشاہد، ڈاکٹر آفاق ندیم خاں، کہت کبیر، مصنف: پروفیسر فیروز عالم، عربی کے اولین سفرناموں میں ہندستانی تہذیب وثقافت، مصنف: ڈاکٹر محمد شاکر رضا، اور پروفیسر سیّد عین الحسن کی تقاریر کا مجموعہ 'عیناتِ حسن' مرتّب: ڈاکٹر محمد شمس الدین کی رسمِ اجرا بھی عمل میں آئی۔ ڈاکٹر چندن شریواستو نے سلسلۂ خطاب جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ نئی تعلیمی پالیسی (این ای پی) کے تحت حکومتِ ہند نے بی بی ایس کو جامعات کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری کا کام سونپا ہے، اس سلسلے میں اردو یونیورسٹی کو مختلف مضامین کی اعلا سطحی اردو نصابی کتابوں کی تیاری کی نوڈل ایجنسی مقرر کیا گیا ہے اور پروفیسر عین الحسن اس کے نوڈل آفیسر ہیں۔انھوں نے مزید کہا کہ کتابوں کی تیاری کی اسکیم میں 4.5 لاکھ اساتذہ اور ماہرین، ایک ہزار سے زیادہ اداروں کی خدمات حاصل کی جارہی ہیں۔ بی بی ایس کتاب یوجنا کے تحت انٹیریکٹیو ای بک کی تیاری پر توجہ دے رہی ہے۔

ڈاکٹر چندن شریواستو نے بی بی ایس کے تحت اردو کتب کی تیاری میں مانو کے سرگرم رول کی ستائش کی اور اعتراف کیا کہ اردو یونیورسٹی نے ابتدا ہی میں جس انداز سے کام کیا ہے وہ دیگر زبانوں کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ پروفیسر رضاء اللہ خاں نے فاصلاتی تعلیم کے حوالے سے خود اکتسابی مواد (ایس ایل ایم) کی تیاری میں درپیش مسائل کا حوالہ دیا اور بتایا کہ مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم 426 ایس ایل ایم تیار کرچکا ہے۔ پروفیسر خالد مبشر الظفر نے افتتاحی کلمات میں کہا کہ ورکشاپ اردو زبان کے فکری، تعلیمی اور علمی مستقبل سے مربوط ایک بامقصد اور دوررس قدم ہے۔اردو زبان میں اعلا تدریسی اور تحقیقی مواد کی تیاری ممکن ہے۔ اس دو روزہ ورکشاپ میں یونیورسٹی کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور بیرونی ماہرین و مصنّفین کی بڑی تعداد شریک تھی۔

(رہنمائے دکن۔حیدرآباد)

ڈاکٹر غضنفر اقبال کو کنڑا ساہتیہ پریشد کی تہنیت

گلبرگہ (16 فروری)۔ وسیم عارف کی اطلاع کے مطابق کنڑا ساہتیہ پریشد گلبرگہ کے زیر اہتمام 22ویں کنڑا ساہتیہ سمیلن کے پُرمسرت موقعے پر ضلع گلبرگہ کے مختلف زبانوں کے منتخب 22 قلم کاروں کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں تہنیت پیش کی گئی۔معروف اردو ادیب ڈاکٹر غضنفر اقبال سہروردی اردو کے واحد قلم کار ہیں جن کی گراں قدر ادبی خدمات کے اعتراف میں جناب وجے کمار پاٹل تیگلتپی صدر نشین کنڑا ساہتیہ پریشد ضلع گلبرگہ کے ہاتھوں تہنیت پیش کی گئی۔ جناب بابا فخرالدین کو سماجی خدمات کے لیے تہنیت پیش کی گئی۔اس موقعے پر جناب شیو کمار انگڑی، جناب سید نظیر الدین متولی، جناب منظور وقار، جناب محمد ایاز الدین پٹیل، ڈاکٹر رحمٰن پٹیل، ڈاکٹر سید چندا حسینی، اکبر انجینئر، قاضی رضوان الرحمٰن صدیقی اور دیگر اصحاب موجود تھے۔

رفتید ولے نہ از دلِ ما

ڈاکٹر محمد مستقیم

مرادآباد۔ مرادآباد سے تعلق رکھنے والے کھیل اور صحافت کی ممتاز شخصیت اور پریس ٹرسٹ آف انڈیا (پی ٹی آئی) کے سینئر صحافی ڈاکٹر محمد مستقیم کا 6 مارچ 2026 کی شام انتقال ہوگیا۔ وہ پچھلے کچھ عرصے سے گردوں کے عارضے میں مبتلا تھے۔ان کے انتقال کی خبر سنتے ہی بڑی تعداد میں سیاسی، سماجی اور صحافتی شخصیات نے برتھلا میں واقع ان کی رہائش گاہ پہنچ کر رنج وغم کا اظہار کیا اوران کے لیے مغفرت کی دعا کی۔ان کے جسدِ خاکی کو 7 مارچ کی صبح برتھلا قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ان کی عمر 62 برس تھی اور وہ ڈسٹرکٹ ہاکی ایسوسی ایشن کے نائب صدر بھی تھے۔

بےخوف صحافت کے لیے اپنی ایک الگ شناخت رکھنے والے ڈاکٹر محمد مستقیم میں بےشمار خوبیاں تھیں۔انھیں امریکہ میں منعقد ہونے والے عالمی ہینڈ رائٹنگ مقابلے میں دوسری پوزیشن حاصل کرنے پر 15 ہزار ڈالر کا انعام بھی ملا تھا۔ 1983 میں ہندستانی کرکٹ ٹیم کے ورلڈ کپ جیتنے کے بعد انھوں نے پی ایچ.ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ ڈسٹرکٹ ہاکی ایسوسی ایشن کے صدر اقبال خاں نے بتایا کہ ڈاکٹر مستقیم خود بھی رنجی ٹرافی کیمپ کیے ہوئے تھے۔ وہ ایک وکٹ کیپر تھے اور اترپردیش کے اسپورٹس ہاسٹل میرٹھ ہاسٹل میں اوپننگ بلے باز بھی تھے۔

ہفتہ وار اخبار 'ٹائمز آف اترپردیش' کے مالک، پرنٹر اور پبلشر کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے سابق قومی ہاکی کھلاڑی مرحوم اظہر خاں کی مغل پورہ میں واقع رہائش گاہ پر ایک تعزیتی میٹنگ کا بھی انعقاد کیا گیا، جس میں مرحوم کے لیے مغفرت کی دعا کی گئی اور ان کے کارناموں کو یاد کیا گیا۔

پروفیسر اعجاز راؤت

ممبئی۔ کوکن کی معروف تعلیمی اور سماجی شخصیت پروفیسر اعجاز راؤت کا طویل علالت کے بعد 10 مارچ 2026 کو انتقال ہوگیا۔ان کی عمر 55 برس تھی۔ 11 مارچ کو رائے گڑھ ضلع کے مان گاؤں تعلقہ، موربہ گاؤں کے قبرستان میں کوکن کے تعلیمی، فلاحی، سماجی اور معاشی شعبوں سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیات کی حاضری میں انھیں سپردِ خاک کیا گیا۔ پس ماندگان میں ایک بیٹا، ایک بیٹی اور بیوہ ہیں۔کوکن کی اہم شخصیات میں اعجاز راؤت کا نام نہایت احترام اور عقیدت سے لیا جاتا ہے۔ وہ محض ایک استاد نہیں بلکہ ایک مکمل ادارہ تھے۔ تعلیم کے ساتھ سماجی اور فلاحی سرگرمیوں میں ان کی بےلوث خدمات قابلِ قدر ہیں۔

جنوبی ممبئی کے مسجد اسٹیشن کے قریب رہائش پذیر پروفیسر اعجاز راؤت نے وڈالا کے ایس آئی ایس کالج میں تقریباً بیس برس تدریسی خدمات انجام دیں۔ وہ قوم وملّت کے نوجوانوں کو اعلا اور تکنیکی تعلیم کی جانب متوجہ کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے اور اپنی قوت کے مطابق اس مہم کو جاری رکھا۔ بدقسمتی سے 8 نومبر 2016 کو نوٹ بندی کے اعلان کے فوراً بعد اپنی دختر کے ساتھ محمد علی روڈ کے ایک اے ٹی ایم گئے تھے، واپسی پر پیش آنے والے خطرناک سڑک حادثے میں شدید طور پر زخمی ہونے سے وہ گذشتہ نو سال سے صاحبِ فراش تھے۔ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر محمد صالح عبداللہ راؤت کے مطابق پروفیسر اعجاز راؤت نے بنیادی تعلیم آبائی گاؤں سے اور الیکٹرانک انجینئرنگ کی ڈگری پین پنویل سے حاصل کی تھی۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : تحدیثِ اقبال (مجموعۂ مقالات)
ترتیب : پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، ڈاکٹر اسعد فیصل فاروقی
اشاعت : 2025
ضخامت : 432 روپے
قیمت : 500 روپے
ناشر : مشکوٰۃ پبلی کیشنز، علی گڑھ
تبصرہ نگار : ڈاکٹر منور حسن کمال
E-mail: mh2kamal@gmail.com

اسلوب احمد انصاری انگریزی کے ایک معروف پروفیسر ہیں اور منفرد نقاد، ماہرِ تعلیم اور ماہرِ اقبالیات وغالبیات کے طور پر اپنی خصوصی شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے غالبؔ اور اقبالؔ کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ان کے کئی بیش قیمت مقالے اور تنقیدی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں اور اہلِ علم نے ان کی ان کاوشوں کو خوب سراہا ہے۔

پیشِ نظر کتاب 'تحدیثِ اقبال' میں گوشۂ علامہ اقبال کے تحت 19 مضامین اور گوشۂ اسلوب احمد انصاری کے تحت ایک درجن سے زیادہ مضامین جمع کردیے گئے ہیں۔ یہ مجموعۂ مقالات پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی علامہ اقبال سے والہانہ عقیدت کے سبب ان کی یادگار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ گوشۂ علامہ اقبال میں جن نابغۂ روزگار شخصیتوں کے مضامین شاملِ اشاعت ہیں، ان میں پروفیسر عبدالحق، پروفیسر قاضی افضال حسین، پروفیسر قاضی جمال حسین، پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، پروفیسر شافع قدوائی، پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، پروفیسر توقیر احمد خاں، پروفیسر محمد نعمان خاں، پروفیسر منظر حسین اور ڈاکٹر شمس بدایونی وغیرہ کے مضامین شامل ہیں، جب کہ گوشۂ اسلوب احمد انصاری کے تحت جن علمی وادبی شخصیات کے اسلوب احمد انصاری کی علمی زندگی، ناقدانہ فکر ونظر اور علامہ اقبالؔ پر اسلوب احمد انصاری کے خصوصی مطالعے پر اہم اور پُرمغز مضامین کو شاملِ کتاب کیا گیا ہے، ان میں پروفیسر اختر الواسع، حکیم سیّد ظل الرحمٰن، پروفیسر عفت آرا، زبیر احمد صدیقی، پروفیسر صغیر افراہیم، ڈاکٹر عبید اقبال عاصم، پروفیسر عتیق اللہ اور منظر حسین، نذرانہ شفیع اور روشن آرا شامل ہیں۔ آخرِ کتاب میں اشاریۂ نقد ونظر علی گڑھ (سیّد مسعود الحسن، پٹنہ) اور کتابیات پروفیسر اسلوب احمد انصاری (اسعد فیصل فاروقی) بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

گوشۂ اقبال میں شامل علامہ اقبالؔ کے کلام کے محاسن پر بڑے پُرمغز انداز میں گفتگو کی گئی ہے، وہیں کتاب میں شامل ڈاکٹر شمس بدایونی کا مضمون اس لیے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ انھوں نے جوشؔ ملسیانی کی کتاب 'اقبالؔ کی خامیاں: تعارف وجائزہ' پر اپنے منفرد انداز میں تحقیقی مقالہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب سے علمی دنیا کے کم ہی لوگ واقف ہوں گے۔

درجِ بالا کتاب کی پیش کش کا مقصد بظاہر علم وادب کی خدمت نظر آتا ہے، لیکن کلامِ اقبالؔ کی اثر پذیری اور خود مصنف کے قلم بند تاثرات اس بات کے غماز ہیں کہ یہ کتاب خود ستائی اور ایک حد تک معاندانہ جذبے کے تحت لکھی گئی ہے۔ کتاب کو فرضی نام سے شائع کرنا بھی اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ مصنف کے دل میں علامہ اقبالؔ سے کسی نہ کسی حد تک حاسدانہ جذبہ بھی پروان چڑھ رہا ہوگا۔

علامہ اقبالؔ کے کلام کا اگر بہ نظرِ غائب جائزہ لیا جائے تو یہ بات شمس بدایونی نے بالکل درست کہی ہے کہ وہ اسلوب کی ندرت، موضوع کی بدعت اور مقصد کے علو پر نگاہ رکھتے تھے۔ اس ضمن میں ان کا رویہ ہمیشہ انفرادی اور مجتہدانہ رہا۔ علامہ اقبالؔ نے شعر ونثر میں معترضین سے متاثر ہوئے بغیر خود کو شاعر نہ کہہ کر انکساری وفروتنی کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ اُس عہد کے مغربی رجحانات اور ان رجحانات کے پیمانوں کے خلاف مہذب احتجاج کرتے ہوئے اپنے شعری رویوں کی وضاحت کردی ہے، ان کے درجِ ذیل اشعار وضاحت کے لیے کافی ہیں:

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے، شاعری کیا ہے

ان اشعار کے علاوہ علامہ اقبالؔ نے اپنے خطوط میں بھی اس سلسلے میں جابجا وضاحت کی ہے، جیسے سیّد سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں نے اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں، جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات اور روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریق اختیار کرلیا ہے ورنہ:

نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست
کہ بر منِ تہمت شعر وسخن بست''

(اقبال نامہ، ص195، بنام سیّد سلیمان ندوی)

'بانگِ درا' پر اگر سوالیہ نشانات کی بات کی جائے تو علامہ اقبالؔ نے صوفی غلام محی الدین کو ایک خط میں لکھا ہے:

''بانگِ درا کی بیشتر نظمیں میری طالب علمی کے زمانے کی ہیں۔ زیادہ پختہ کلام افسوس کہ فارسی میں مرتّب ہوا۔ بہتر طریق یہ ہے کہ 'بانگِ درا' سے بعض نظمیں منتخب کرلی جائیں''۔ (اقبال نامہ، ص299)

اس پس منظر میں علامہ اقبالؔ کی شاعری کے حوالے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ 'اقبالؔ کی خامیاں' کے مصنف نے اقبالؔ کے نظریۂ شاعری اور اس کے مافی الضمیر کو علاحدہ کرکے ان کے کلام میں نقص تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جوشؔ ملسیانی (مصنفِ کتاب) نے فن کے دائرے سے باہر نکل کر کلامِ اقبالؔ کی موضوعی اور فکری ہمہ گیریت اور اقبالؔ کے مافی الضمیر کو سمجھنے کی سعی ہی نہیں کی۔ انھوں نے شعر کے حسن وقبح کو ظاہری ضابطوں کے مطابق ہی پرکھنے کی کوشش کی ہے، جنھیں من وعن قبول کرنا ممکن ہی نہیں ہے الّا یہ کہ جب تک کلام کی تاریخِ تحریر اور شاعر کی ذہنی اختراعیت کو ملا کر نہ دیکھا جائے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں اسلوب احمد انصاری پر مضامین کے ساتھ ساتھ ان کی بعض ان تحریروں کو بھی شاملِ کتاب کیا گیا ہے جو علامہ اقبالؔ اور ان کے نظریۂ شاعری سے متعلق ہیں۔ اس حصے میں شامل مضامین میں 'اسلوب احمد انصاری کا زاویۂ نقد اور معرفتِ شعرِ اقبال'، 'شیدائیِ اقبالؔ اسلوب احمد انصاری'، 'پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا مابعد الطبیعیاتی نظریہ ونقد اور شعرِ اقبالؔ'، 'اسلوب احمد انصاری کا تنقیدی رویہ: نظم خضرِ راہ کے حوالے سے' اور 'پروفیسر اسلوب احمد انصاری: ایک آئینۂ روشن' اور 'آئینۂ خانہ میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا عکس' وغیرہ اہم مضامین ہیں۔ ان مضامین میں جہاں کلامِ اقبالؔ کو نئے زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہیں، وہیں اسلوب احمد انصاری کے اسلوب پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

امید ہے اس سے روشنی کی لکیریں پھوٹیں گی اور اقبالؔ اور اسلوب احمد انصاری کی تہذیبی، لسانی، ثقافتی اور نظریاتی جہتیں واضح شکل میں سامنے آسکیں گی۔ ◆◆

'ڈی فارم' ہفتہ وار 'ہماری زبان' نئی دہلی

1- مقامِ اشاعت: اردو گھر، 212-راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
2- وقفۂ اشاعت: ہفت روزہ
3- پرنٹر کا نام: عبدالباری
شہریت: ہندستانی
پتا: اردو گھر، 212-راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
4- پبلشر کا نام: عبدالباری
شہریت: ہندستانی
پتا: اردو گھر، 212-راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
5- اڈیٹر کا نام: اطہر فاروقی
شہریت: ہندستانی
پتا: اردو گھر، 212-راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
6- ان لوگوں کے نام جو اخبار کے مالک یا حصے دار ہیں یا ایک فیصد حصص کے مالک ہیں:
انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، 212-راؤز ایونیو
نئی دہلی-110002

"میں عبدالباری تصدیق کرتا ہوں کہ اوپر دی گئی معلومات میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں".
عبدالباری
(مارچ 2026)
انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، 212-راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002

اے عشقِ جنوں پیشہ

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

کا امتزاج ہے۔ شاہد حمید صاحب اس اصولِ تخلیق کے حد درجہ قائل تھے۔ ان کے رویے میں فلسفۂ زمان ومکاں بہت اہمیت رکھتا تھا اور یہی اللہ تعالیٰ کی تدبیر عام کا مظہر ہے جو افتخار عارف صاحب جیسے صاحبِ علم وکمال کے جملوں میں پنہاں ہے کہ ''جب بھی جہلم کی طرف سے گزر رہا ہوتا ہوں یا بک کارنر کی کوئی کتاب پڑھ رہا ہوتا ہوں، مجھے بڑے شاہد صاحب بہت یاد آتے ہیں۔ وہ جہاں بھی ہوں گے بہت مطمئن بہت خوش ہوں گے کہ امراو گگن نے ان کے ایک خواب کو تعبیر سے ہمکنار کیا ہے۔'' بلاشبہ یہ سطور شاہد حمید صاحب کی شخصی تفہیم کے لیے کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔ شاہد حمید صاحب کے یہاں یہ تدریجی مراحل اپنی بے پناہ دریافتوں اور انکشافات سے گزرتے ہیں اور کردار کا یہ شعور، دریافت واستعجاب کی مکانی کشش سے گزر کر زمانی خلا کو پر کردیتا ہے۔ انھوں نے علامہ اقبالؔ کے اس مشورے پر عمل کیا ہے:

اپنی دنیا آپ پیدا کر، اگر زندوں میں ہے

خالقِ کائنات نے ایک خاص انداز میں اپنی جود وعطا سے ہر ڈھونڈنے والے کو نئی دنیا کے نشانات عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ شاہد حمید صاحب کی طبیعت کے مثبت وروشن خیال جواہر، معقولیت اور توانائی سے معمور جذبے، حیات اور روح کی غایت بالیدگی، تعقل اور فکری آگہی پر مشتمل نظریات نے ان کی بے مثل شخصیت کو ان کے امکانی نشوونما کے مدارج کا استعارہ قرار دیا ہے۔ فاؤسٹ کا کردار بھی بیکراں تمناؤں کا مجموعہ ہے جو عالم امکاں کی تسخیر کے خواب دیکھتا ہے اور نجات

کے لیے ترکِ آرزو کا قائل نہیں۔ اس کے نزدیک انسانی قلب میں موجود آرزوؤں کی تخلیق میں ہی زندگی کا راز پوشیدہ ہے اور وہ اپنی جہدِ مسلسل اور اپنے جذبۂ ایثار کے سہارے منفرد و مختار بن سکتا ہے، یعنی:

کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ انداز

اور یہ بھی کہ:

کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

اقبال کے صاحب ادراک اور شاہد حمید صاحب میں یہ قدرِ مشترک ہے کہ ہر دو کے رویے انسانی جذبِ دروں پر اکتفا کرنے اور اپنی انسانی موضوعیت سے فرد کے بے مثل وجود کے تجربے کو حقیقت کی رسائی عطا کرتے ہیں۔ گویا شاہد حمید صاحب اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اولاً اپنے وجود کی داخلی صفات سے آگہی حاصل کر لی جائے بعد ازیں تگ و تاز اور جد و جہد سے تجدید اور اجتہاد کا در بھی وا کیا جائے تا کہ ذہن کی آزادی اور ارتقائی حرکیات کے قوانین کو اپنی زندگی میں لازم و ملزوم رکھا جا سکے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اس فلسفے کو بڑی شد و مد کے ساتھ مدنظر رکھا کہ فرد محض اپنے زمان و مکاں میں محدود و مقید نہیں بلکہ اپنی ذات کے اثبات کے لیے اُسے اپنے ہی جیسے افراد سے ایک نامعلوم وابستگی کے رشتے میں بندھنا لازم ہے۔ شاہد حمید صاحب ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ تقلیدِ محض سے زندگی کی تعمیر و توسیع نہیں ہو سکتی۔ وسیع و عظیم تر مقصد کے لیے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس حقیقت کا اظہار حسن رضا گوندل کے مضمون میں بھی ہوتا ہے جب وہ کہتے ہیں کہ ''ان سے ملاقات کا وعدہ پورا نہ ہو سکا، مگر نہیں۔۔۔ شاہد حمید کہیں نہیں گئے۔۔۔ وہ گگن شاہد اور امر شاہد کے روپ میں موجود ہیں۔ وہ بک کارنر سے چھپنے والی ہر کتاب میں موجود ہیں۔ ہر کتاب کے ٹائٹل کے پس منظر میں ان کا ہنستا مسکراتا پر رونق چہرہ موجود ہے۔ جب بھی کوئی کتاب کھولتا ہوں ان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ جب تک بک کارنر موجود ہے۔ جب تک کتاب موجود ہے۔ شاہد حمید موجود ہیں۔''

وجودیت کے فلسفے میں فرد کی خود آگہی کو اہمیت دی گئی ہے۔ یہ انسان کو اس کے باطن سے متعارف کراتا ہے جو اس کی شعوریت کا جزوِ لازم بن جاتا ہے۔ شاہد حمید صاحب کی شخصیت بھی در حقیقت ایسی ہی تھی کہ شعور کی باطنی گہرائیوں سے ان کی خودی کی حقیقی ماہیت اور ان کا شخصی جوہر منکشف ہوتا ہے۔ نطشے کا فوق البشر ہو یا اقبال کا مردِ کامل، زندگی کے کشاکش اور مصائب سے کمال متانت کے ساتھ نبرد آزما ہونا اُسے اپنی اور دوسروں کی نظروں میں افضل اور برتر بنا دیتا ہے۔ مادی دنیا اس کے سامنے مثلِ خس و خاشاک ہو جاتی ہے اور وہ توکل و وضع داری کی نعمت کی سرفرازی کی بدولت اپنے ہونے کا اقرار کر کے دراصل اپنی خودی کی تکمیل کرتا ہے۔ جذبے کی یہ شدت فرد کے باطن میں کائنات کی سب سے اہم حقیقت کے فہم کا احساس بیدار کرتی ہے۔ شاہد حمید صاحب کے یہاں فہم و ادراک کی یہ خوبی جب فرد کی محدودیت سے اس کی وسعت کی جانب قدم بڑھاتی ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فرد کی شخصی و نظریاتی وسعت کی علم بردار ہے۔ عناصر کا یہ امتزاج ان کی شخصیت کی پہچان، اس کی خواہشات اور اس کے دوام پر سوال اُٹھاتی ہے اور جواب ان کی زندگی کے فلسفے سے ہی برآمد ہوتا ہے، اسی لیے صدف مرزا صاحبہ کا یہ کہنا کس قدر درست اور سچ ہے کہ ''شاہد برادران نے ورثے میں اپنے والد کی وضع داری پائی ہے''۔ عبدالحمید عدم کے خیال میں:

کہتے ہیں کون عمرِ رفتہ کبھی لوٹتی نہیں
جا میکدے سے میری جوانی اُٹھا کے لا

سارتر نے وجودیت (Existentialism) کے فلسفے کو نئے رنگ عطا کیے ہیں جس میں انسانی ذہن کے اکتشاف و بازیافت کے ہزارہا مثبت و منفی، ہر دو پہلو کبھی مخفی اور کبھی موجود ہوتے ہیں جو کبھی معاون اور کبھی مزاحم کی حیثیت سے انسانی فطرت میں اپنے اظہارات کو راستہ دیتے ہیں۔ اس فلسفے کی روشنی میں دیکھا جائے تو شاہد حمید صاحب نے اپنے نظامِ فکر میں انسانیت اور زندگی کی خیر خواہی کا ایک راست زاویہ متعین کرنے کی سعی کی ہے اور یہ پیغام دیا ہے کہ شر کے برعکس خیر اور سلامتی سے معمور فتح، بہر صورت حضرت انساں کا ہی مقدر ہے۔ انھوں نے عالمِ آب و خاک میں گفتگو، تجزیات، رائے عامہ اور تجاویز کو لفظ کی تجسیم کی عطائی کی قدر و قیمت کا درست اندازہ کیا ہے اور علم و شعور کے جہانوں کو معلوم و یقینی ترتیب میں تبدیل کرنے کی کامیاب سعی بھی (Noble Enterprise) کی ہے۔ ان کا عشقِ کتب ان تمام باتوں کا گواہ اور مدلل و مستند بنیادوں پر قائم ہے اور یہ الفاظ جن تاریخی و بشریاتی معنوں میں ادا کیے گئے ہیں ان کی نثری تفہیمات شاہد حمید صاحب کی کتاب 'اے عشقِ جنوں پیشہ' میں اپنی مکمل معنویت کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔

کتاب میں موجود متن کا مطالعہ قاری پر واضح کرتا ہے کہ فکری و بشریاتی خوبیوں کے اظہارات اپنی درونِ ذات (Self Conscience) برآمد کرنے کے ہنر کا واضح و بین اظہار شاہد حمید صاحب کی شخصیت میں نمایاں ہے۔ ان کی کثیر جذبی صلاحیتوں (Hybrid abilities) نے معاشرت و ثقافت کے مختلف النوع پہلوؤں کی نمائندگی نمایاں و ممتاز خطوط پر کی ہے۔

اسپنگلر (Oswald Spengler) نے اپنی کتاب 'زوالِ مغرب' میں عالمی تاریخ کے مسائل کو تصورِ قضا و قدر اور اُصولِ علیت (Causality) کی روشنی میں بیان کیا ہے اور ان ہی اصولوں کو تعمیرِ عالم کی اساسیت تسلیم کیا ہے۔ انسان کی عالمی بصیرت، اس کی عالمی آرزو کو جنم دیتی ہے جسے وہ قضا و قدر کی لازمی صورت کو تسلیم کرنے کے باوجود ہمہ وقت کائناتی مسائل کے حل کی جانب متوجہ رہتا ہے اور حیات و موت کے علت و معلول ((Cause and Effect) کے رشتے کو پائدار سمجھتا ہے۔ صدف مرزا لکھتی ہیں کہ ''قرطاس و کتاب سے جنونی عشق کرنے والی ہستی کو کاتبِ کائنات، عشق کی کتاب کے صفحۂ اول پر نورانی لفظوں میں لکھے گا۔ آمین'' اور یہ بھی کہ ''یہ نور بھرا چراغ تو تہہ خاک بھی روشن ہے۔''

ابنِ عربی نے تخیل (Thought) کی تخلیق کو تخلیقات میں عظیم تر قرار دیا ہے اور اس تخیل کو دو دنیاؤں میں منقسم کرتے ہوئے اسے حواس اور تجرید کے نام سے موسوم کیا ہے۔ حواس اور تجرید اپنی فطری صلاحیتوں کے زیرِ اثر اپنے آس پاس ہونے والے واقعات و حوادث کی پیش بینی کر سکتے ہیں اور یہی دور اندیشی، عقل و شعور کی مدد سے انسانی معاشرت اور انسانی ارتقا کی تفہیم میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ شاہد حمید صاحب نے بھی اپنے اسی تخیل کی بنیاد پر آفاقی صداقت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر ایک سماجی و ثقافتی تغیر کو سمجھنے کے لیے ان تمام حالات و واقعات کو سمجھنا ضروری ہے جن حالات سے ان ممکنہ تبدیلیوں کا ربط ہے۔ جمالیاتی بنیادوں پر ان کی زندگی کے ان حقائق تک پہنچنے کے لیے حواس، عقل، فکر اور تخیلات کو بہ لحاظِ کمیت اور بہ لحاظِ کیفیت، ہر دو صورتوں میں بروئے کار لانا ضروری ہے اور جمالیات و رجائیت کے یہ احساسات ان کے دل کے جذبِ دروں میں ان کے گہرے و پائدار مطالعاتِ حیات کے سبب ہی استوار ہوئے ہیں۔ افتخار عارف جیسے صاحبِ علم و فکر شخصیت نے شاہد حمید صاحب کی ان ہی صوفیانہ اختصاصی خوبیوں کے لیے یہ الفاظ کہے کہ ''کتاب پسپائی کے مراحل سے گزر رہی ہے۔ ایسے میں یہ خبر کسی بشارت سے کم نہیں تھی کہ شہرِ جہلم میں کہ جس کی غالب شناخت عسکری رہی ہے، ایک کتاب گھر وجود میں آیا ہے اور جس کے کرتا دھرتا دو نوجوان ہیں، گگن شاہد اور امر شاہد۔ ان کی پُشت پناہی ان کے والدِ بزرگوار حضرت شاہد حمید کرتے رہے۔ حیرت ہوئی کہ جانتے بوجھتے بیٹوں کو ایک اوکھے کام پر لگانے والا آدمی کتاب اور صاحبانِ کتاب کا عاشق ضرور ہوگا۔''

ولیم شیکسپیئر نے The Tempest میں اپنے ایک کردار Miranda سے یہ مکالمات کہلوائے تھے کہ "O, I have suffered with those that i saw suffer"۔ شاہد حمید صاحب کے یہاں بھی گفتگو کے موضوعات، مطالعاتِ کتب و اشاعتِ کتب میں ان کے فکری بیانیے اور ان کی پیش کش کا انداز ان کی ذہنی، قلبی اور نفسیاتی جد و جہد تک پہنچنے کی کلید ہے جو انھوں نے ساری عمر کمال شعور، سمجھداری، بہادری اور جذبۂ حب الوطنی کے ساتھ انجام دی۔ یہ دردمندی اور احساس، تہذیبی شعور کی کلیت (Holistic) کے سبب سے ہی ان کی کی زندگی میں شمولیت پاتی ہیں۔ شاہد حمید صاحب کی دور بینی نے یہ بھانپ لیا تھا کہ سماجی اور معاشرتی نظام کے اَن مِٹ اور لازوال ہونے کے لیے یہ لازم ہے کہ انسانی تواریخ اپنے فکری تغیرات اور نظریاتی میلانات کی متضاد کیفیات کے باوجود یک قالب ہو کر اپنے اثرات میں یکسانیت لیے ہوئے ہوتی ہے لہٰذا مختلف النوع ادوار میں جاری و ساری نظاموں کی شکستگی، مرحلۂ تاریخ کا کوئی سرسری یا لمحاتی مطالعہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا تسلسل ہمیشہ اور ہر شعبۂ حیات میں قائم رہتا ہے۔ منافقت اور نظامِ زندگی میں مطلب برآری کا عمل تاریخ کو درست طور پر مرتب و مدون کرنے کے عمل سے ہمیشہ ہی گریز کرتا ہے، جب کہ سماجیات کے عمل میں اگر عام آدمی کا چہرہ وضاحت اور واقعیت کے ساتھ دکھایا جائے تو یہی کامیابی و فلاح کی علامت ہے۔ 'زندگی سے ڈرتے ہو' ن م راشد کی ایک شہرۂ آفاق نظم ہے۔ اس نظم کے چند مصرعے دیکھیے:

لب اگر نہیں ہلتے، ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں
ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں، راہ کا نشاں بن کر
نور کی زباں بن کر
ہاتھ بول اٹھتے ہیں، صبح کی اذاں بن کر
روشنی سے ڈرتے ہو
روشنی تو تم بھی ہو، روشنی تو ہم بھی ہیں

اس نظم کے مندرجات کو تدریجی انداز میں برتتے ہوئے حمید شاہد صاحب نے بھی شخصی و فکری بصیرت کو ہم آہنگ کر دیا ہے اور اسی ترتیب کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی اختصاصی شخصی بصیرت (Specialized Individual Acumen) ان کے خیالات میں ایک پختہ اور مثبت فکر کی موجودگی کو ثابت کرتی ہے۔ حالات کے درست، صریح اور مبنی برحقائق احساس و ادراک ان کے ذوقِ کتب کی تخلیقی لَے (Taste of Creation) کو نہایت اثر انگیز اور پائدار انسانی عظمت کا شاہ کار بنا دیتے ہیں۔ شاہد حمید صاحب کے وجدان کا زندگی کے شعور سے رفتہ و پیوستہ انسلا کی ربط یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کی عملی زندگی میں انسانی سچائی اپنی بقا کی تلاش میں سرگرداں و متمنی رہی تھی اور پیہم ہے۔

پیٹر واٹسن (Peter Watson) نے کہا تھا کہ کائنات کی اساسیت عقلی بنیادوں پر قائم ہے۔ یہی عقلی بنیادیں، زاویۂ نظر اور فکری رجحانات شاہد حمید صاحب کی شخصیت، تصورات، ان کے تخلیقی مظاہرات اور جہلم کی فضاؤں میں موجود بک کارنر، گگن شاہد اور امر شاہد کی شخصیات میں اپنی تکمیلیت تک رسائی پاتے ہیں۔ بقول اقبال:

اسی کش مکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی

Drsaimazeeshanurdu@gmail.com

اے عشقِ جنوں پیشہ

صائمہ ذیشان انصاری

لارڈ میکالے نے ایک جگہ یہ کہا تھا کہ ''تاریخ بیان کا ایک فن ہے، اس سے انسانی تاثرات میں دل چسپی پیدا ہوتی ہے، تصور کے سامنے تصویریں آتی ہیں، لیکن ضروری ہے کہ مختلف واقعات کو ہنرمندانہ طریق پر انتخاب کیا جائے اور انھیں مناسب ترتیب سے پھیلا دیا جائے اور اپنے دماغ سے کچھ ایجاد واختراع نہ کیا جائے۔''

تاریخ کے اس تصور کو مدِ نظر رکھا جائے تو یہ انسان کی سرمدی زندگی کا استعارہ اور علامات کا فکری نظام قائم کرتا ہے۔ شاہد حمید صاحب کی زندگی اسی سرمدیت کا استعارہ ہے جس کا اظہار 'شاہد حمید، اے عشقِ جنوں پیشہ' میں بارہا کیا گیا ہے۔ یہ کتاب 'شاہد حمید: اے عشقِ جنوں پیشہ' بک کارنر جہلم کا محض ایک اشاعتی کارنامہ ہی نہیں بلکہ دو نہایت سعادت مند اور قابلِ فخر بیٹوں گگن شاہد صاحب اور امر شاہد صاحب کا اپنے والد محترم کی خدمت میں جذبۂ محبت و بے پناہ عقیدت سے معمور پیش کیا گیا آراستہ و پیراستہ 'ارمغان' ہے جس کی اصل قدر و قیمت کے تعین میں شاہد حمید صاحب کی عظیم لافانی شخصیت کے مضمرات پنہاں ہیں۔

کامل شخصیت اور خودی کے نظریے کے ابتدائی مدارج میں تخلیقی فعالیت نمودار ہوتی ہے۔ یہی خودی جب فرد کی محدودیت سے لامحدودیت کی جانب قدم بڑھاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فرد کی آزادی کا علم بردار، یہی فلسفۂ خودی ہے جو دراصل انسانی شخصیت کی پہچان، اس کی خواہشات اور اس کے دوام پر سوال اُٹھاتا ہے اور جواب بھی اسی خودی کے فلسفے سے برآمد ہوتا ہے۔ شاہد حمید صاحب کی شخصیت، گفتگو، لین دین، ان کے برتاؤ، عملی و عائلی زندگی میں ان کے رویوں کے بارے میں ان کے صاحبزادے جو باتیں احاطۂ تحریر میں لے کر آئے ہیں، ان لفظوں میں موجود سچائی نہایت اہم اور مبنی بر حقیقت ہے۔ علم الرجال کے مراحل بھی یہی ہوتے ہیں کہ روایت بیان کرنے والے کی شخصیت بھی مدنظر ہوتی ہے۔ کتاب کا پہلا مضمون 'پاپا' ہے، یہ مضمون ان کے بڑے صاحبزادے گگن شاہد صاحب نے تحریر کیا ہے۔ مذکورہ مضمون کے یہ سطور نہایت اہم ہیں کہ "شاہد حمید صرف والد نہیں تھے، دوست تھے، مربی تھے، محسن تھے، استاد تھے، entrepreneur تھے، صاحبِ ذوق تھے، کتاب دوست تھے، آرٹسٹ تھے، وہ ہمارے لیے جدو جہد اور ہمت کا استعارہ تھے اور بہترین رول ماڈل تھے۔'' ایک بیٹے کی جانب سے یہ الفاظ شاہد حمید صاحب کی خوبیوں کی مدلل معنویت کا واضح اور پُرخلوص اظہار ہیں۔

'اے عشقِ جنوں پیشہ' میں موجود تمام مضامین شاہد حمید صاحب کے فکر وخیال کے وسیع اقلیم سے عبارت ہیں اور ان مضامین میں ان کی زندگی کے اہم تقاضوں اور زندہ معاشرتی قدروں کی تقویت کے احساس کو کمالِ خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ شاہد حمید صاحب کی ایسی خوبیاں ہیں جو معاشرے کے لیے ہمیشہ بیش بہا سرمایہ ثابت ہوں گی۔ ان کی شخصیت کا ایک تخصیصی پہلو یہ ہے کہ امر شاہد صاحب (شاہد حمید صاحب کے دوسرے صاحبزادے) نے بھی تحسین وعقیدت کا بزبانِ شعر اظہار کیا ہے اور اس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچایا ہے کہ شاہد حمید صاحب کے حیات کے مختلف النوع گوشوں کی مرکزیت میں احترامِ آدمیت، احترامِ کائنات، احترامِ قلم و کتاب اور عرفانِ خودی کا صیغہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور یہ ایک ایسے فرد کا رویہ ہے جس کی ذات میں انسانی فطرت کی سچائی، غیر محسوس انداز میں مسلسل شامل رہتی ہے۔ ایک ایسا انسان جو ایک مختلف، بہتر اور کامل دنیا کی تعمیر کی خواہش میں مبتلا ہے، یعنی ان کی شخصیت میں ایسی قوتِ ارادی اور توکل کی نعمت کی شمولیت تھی جو کسی بھی وجود کو کام یابی اور کامرانی کا متلاشی بناتی ہے اور اس عرفانِ ذات کا سرچشمہ فرد کی موضوعیت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ علامہ اقبالؔ نے ایسے ہی موقعے کے لیے کہا تھا:

ہو اگر خودنگر و خودگر و خودگیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

شاہد حمید صاحب نے توقیرِ نفس، عرفانِ نفس اور اپنے فلسفۂ زندگی میں سہل پسندی سے پہلوتہی اور بصیرت افروز انداز کو اختیار کرکے اپنے فکری قد وقامت اور مقام کو مفکروں و دانشوروں کے سامنے متعین و واضح کیا ہے اور آتشِ رفتہ کے ایسے سراغ فراہم کیے ہیں کہ کھوئے ہوؤں کی جستجو کے اسرار کی وضاحت ہوتی ہے۔ ان کی شخصیت میں تاریخی اور ابدی وہ حقائق موجود ہیں جو ان کے بعد بھی روشن وتابناک رہیں گے۔ شاہد حمید صاحب نے دنیائے کتب میں انسانی فکری رجحانات اور نفسیات کا تجربہ وتجزیہ مدلل بنیادوں پر کیا، مطالعے کا دائرہ وسیع کیا اور مطالعے کے ذوق وشوق کو زمان ومکاں کی سی وسعت عطا کی۔ ان تمام باتوں کی روشنی میں شاہد حمید صاحب کے ان نظریات وسعیِ پیہم کی تصدیق وتائید ہوتی ہے کہ انھوں نے کتاب کی بقا اور اس کے احیا واستحکام کی تشکیل کو ممکن بنایا ہے اور مطالعۂ کتب کی فکری جہات اور معنویت کی وضاحت اپنے عمل سے کی ہے۔ یہ فکری جہت دراصل شاہد حمید صاحب کے یہاں خالقِ کائنات کے ساتھ یقین و اعتماد کی حامل رہی ہے کیوں کہ خالقِ کائنات کا پیغام بھی الکتاب ہے۔ گویا انسان کی تخلیقیت میں قلم وقرطاس کی اہمیت خالقِ کائنات کی عظیم پکار کا جواب ہے۔ بلاشبہ شاہد حمید کا نظامِ فکر اس عظیم پکار کے جواب کے موضوعات ومباحث سے تشکیل پاتا ہے۔ ان کی شخصیت اپنے رویوں میں بہت متنوع ہونے کے ساتھ ساتھ علم وشعور کی مرکزیت سے معمور ہے۔ وہ تخلیقِ آدم اور انسان کا مقصدِ حیات، خیر وشر، قوموں کا عروج و زوال، موت وحیات کی حقیقت اور موجودہ تہذیب کی دشواریوں سے نوعِ انسانی کی نجات کا طریقہ اور ان سب کی اساسیت کتاب کو قرار دیتے ہیں۔ شاہد حمید صاحب کے نظریات کی بنیادیں انسانی وجود کو جدو جہد کے نظریاتی حظ سے آشنا کراتی ہیں۔ یہ وہی جدو جہد ہے جس کی بنیاد پر فرد اپنا جہان تخلیق کرنے کی استعداد اور حوصلہ رکھتا ہے۔

رؤف کلاسرا صاحب اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: ''سیلف میڈ لوگ بھی کمال کے ہوتے ہیں۔۔۔ کامیابی لہو مانگتی ہے، محنت مانگتی ہے۔ ایک جنون، ایک پاگل پن درکار ہے۔ گھر بیٹھے کچھ نہیں ملتا۔ گوتم کی طرح نروان پانے کے لیے سات دریا اور سات جنگل عبور کرنے پڑتے ہیں۔ شاہد حمید صاحب نے یہی کیا۔''

البرٹ کامو (Albert Camus) کی کتاب The Rebel میں مصنف نے ان خصائص کو آدمیت کی اساس قرار دیا ہے۔ البرٹ کامو کہتا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ کوئی بھی شخص پرانی روایات اور سماجی و مذہبی تحریکات کی اسیری میں اپنی زندگی گزار سکتا ہے مگر انسانی زندگی میں وہ خطِ فاصل اہم ہے کہ جس کے سبب سے فرد اخلاقیات، اقدار اور تحریکات کی فرسودگی کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ یہ خطِ فاصل بک کارنر جہلم کے بانی اور اس کے روحِ رواں شاہد حمید صاحب کے یہاں کمالِ خوبی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں فرد اپنی جدو جہد سے دست بردار نہیں ہوتا۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ اپنی ذات کی معراج کے لیے انسان کو اپنی جدو جہد کی دست برداری سے گریز کرنا پڑتا ہے وگرنہ وجودِ آدمیت، بدعقیدگی (bad faith) یا غیر مصدقہ وجود میں تبدیل ہوجائے گا۔

شاہد حمید صاحب کے نزدیک جدو جہدِ مسلسل اور خدا کی ذات پر کامل توکل درحقیقت انسان کی اپنی ذات کی تفہیم ہے جو اس کی ذات کی استواریت، استقامت اور یقین کی ہم آہنگی ...(بقیہ صفحہ 6 اور 7 پر)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
معاون مدیران : منور حسن کمال، سالم فاروق
Assisistant Editors : Munawwar Hasan Kamal
Salim Farooq
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-٦
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***